خلاف نعرے لکھے تھے اور دیواروں کے اندر پتھروں کی دراڑوں میں ہر طرح کے کیڑے مکوڑوں کے عارضی مسکن تھے۔ کچھ مکوڑیں انڈے دے کر فارغ ہو چکی تھیں، کچھ حاملہ تھیں اور باقیوں کے یہاں ابھی نسل کشی کا سلسلہ جاری تھا۔

مفتی نے چلا کر کہا:

"اوئے حرامزادو! آہستہ چلو۔ پتہ نہیں تمہارے ساتھ ستّر سال کا ایک بوڑھا چل رہا ہے۔"

ہم سب نے پلٹ کر دیکھا۔ ہمارا ستّر سالہ بوڑھا ایک نوجوان گجری اور اُس کے کم عُمر بھائی کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا اور انہیں جیب سے کچھ نکال کر دے رہا تھا۔ مفتی ہمیں روکنا نہیں چاہتا تھا، بلکہ ہمیں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا۔

عمر نے کہا:

"دیکھا دیکھا، میں نہ کہتا تھا کہ اس کمبخت کو ساتھ لے کر نہ چلو۔ یہ ہم سب کو دکھا دکھا کر اور ترسا ترسا کر مارے گا۔"

"اسی کی تو ساری برکت ہے عُمر۔" مسعود نے اپنی مخصوص ہکلاہٹ میں جواب دیا اور پھر سر ہلا ہلا کر خوش دلی سے مسکرانے لگا۔

مسعود بڑا کمینہ اور چھوٹے لیول کا دنیا دار انسان ہے لیکن وہ اپنے دوستوں کی خوبیوں اور ان کی صلاحیتوں کی دل کھول کر داد دینے کا عادی ہے۔ سامنے ہو تو شاید شرما جائے۔ لیکن پیٹھ پیچھے اس کو اپنے دوستوں کی ثنا کرنے میں بڑا لُطف آتا ہے اور وہ بڑی ایمانداری اور خلوصِ نیّت کے ساتھ اس لُطف کے چسکے لیتا رہتا ہے۔ پچھلے سال کے مقابلے میں اب عمّار پر بھی مسعود کی اس خصلت کا رنگ چڑھنے لگا ہے اور وہ بھی اس لُطف میں گھُٹنے گھُٹنے ڈوب چکا ہے۔ ایک میں اور عمر اس دائرے سے باہر رہ گئے ہیں۔ عمر چونکہ سادہ لوح اور عاشق مزاج انسان ہے، اس لیے وہ اس دائرے میں کُود پھاند کر آتا ہے۔ لیکن میں کبھی اس کھیل میں شریک نہیں ہُوا۔ مجھے شروع ہی سے غیبت اور منافقت پسند ہے اور میری اَنا نے آج تک کبھی یہ برداشت نہیں کیا کہ میرے ہوتے ہُوئے کسی اور کی تعریف ہو۔ کسی اور کی بات ہو اور اس

گفتگو میں میرے ہی دوست شریک ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اخلاقی طور پر یہ ایک بُری اور قبیح عادت ہے، لیکن یہ عادت میرے ساتھ پیدا ہوئی ہے، عین اس مسّے کی طرح جو میرے دائیں گال پر ہے اور جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

خان بابا سے ہم نے دو کوٹھڑیاں کرائے پر لیں۔ آٹھ رُوپے یومیہ کے حساب سے۔ ہر کوٹھڑی میں تین چارپائیاں تھیں۔ مُفتی، مسعود اور میں ایک کوٹھڑی میں۔ اعظمی، عُمر اور عماد دُوسری کوٹھڑی میں۔ درمیان میں لکڑی کی دیوار تھی۔ لکڑی سوکھ جانے سے جوڑوں میں بڑی بڑی دراڑیں پیدا ہوگئی تھیں۔ ہم ایک دُوسرے کے ساتھ باآسانی بات کرسکتے تھے اور ایک دُوسرے کو کپڑے بدلتے ہوئے بھی دیکھ سکتے تھے۔ دراصل اس دیکھنے کا احساس ہمیں عماد نے دلایا جو ہر مرتبہ پائجامہ بدلتے ہوئے آواز لگایا کرتا تھا کہ ادھر نہ دیکھنا، میں پتلون اُتار رہا ہوں۔ اس کے جواب میں مُفتی ہمیشہ عینک لگاکر کہا کرتا تھا:

"بدل بدل، ہم نہیں دیکھ رہے۔"

جب ہم ان کوٹھڑیوں میں اپنا اپنا سامان قرینے سے فرش پر لگاکر چارپائیوں پر لیٹ گئے، تو پہاڑوں کی چوٹیوں سے شام اُترنے لگی۔ میں نے تنگ دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا اور ریڈیو اناؤنسر کی طرح اعلان کیا:

"آئی شام آئی شام آئی شام۔"

مسعود نے سر ہلاکر کہا:

"واہ!"

میں نے کہا:

"یہ میرا فقرہ نہیں مسعود! یہ اُردو کے ایک بہت بڑے افسانہ نگار رفیق حسین کا فقرہ ہے۔"

"رفیق حُسین!" مُفتی نے حیران ہوکر پُوچھا۔ "رفیق حسین کون؟"

میں نے کہا:

"میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ 'ساقی' میں اس کے افسانے چھپتے تھے۔

بعد میں ایک کتاب "آئینۂ حیرت" کے نام سے شائع بھی ہوئی۔ میرے پاس تھی، پتہ نہیں کون لے گیا، لیکن اس سے بڑا افسانہ نگار اُردو کو اب تک کوئی نہیں ملا۔"

میرے اس دعوے کو مسعود اور مفتی دونوں نے باطل جانا اور رفیق حسین سے لاتعلقی کا اظہار کر کے خاموش ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد مسعود بولا:

"پتہ نہیں کیسا افسانہ نگار ہوگا، لیکن یہ فقرہ غضب کا ہے: آئی شام، آئی شام، آئی شام"

باہر ٹھنڈی ہوا چلنے لگی اور شام سیاہ رنگ کے گھیرے کی طرح خاموشی سے قدم اُٹھاتی ہماری چوکھٹ کے باہر آکر بیٹھ گئی۔ پہاڑوں کی شام محبت کرنے والی عورت کی طرح ہوتی ہے۔ خاموش، اُداس، UNDEMANDING شفیق اور کربناک۔ اس کے وجود سے ویسی ہی خوشبو آتی ہے جیسے فرقت زدہ عورت کی لوئی سے آیا کرتی ہے۔ اُون کی خوشبو، جسم کی خوشبو، رنگ کی خوشبو، آنسوؤں کی خوشبو۔ جس طرح گرمیوں کی شامیں سردیوں کی شاموں سے مختلف ہوتی ہیں اسی طرح پہاڑ کی شامیں میدانی شاموں سے مختلف ہوتی ہیں، پھر ہر پہاڑ کی اپنی شام ہوتی ہے۔ کسی میں درختوں کی بُو باس شامل ہوتی ہے، کسی میں ندی نالوں کی۔ کسی میں پتھروں کی اور کسی میں رات کے جوہڑوں کی۔ خوشبو کے بارے میں اب تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہو سکا کہ فلاں خوشبو خوشگوار کیوں ہوتی ہے اور فلاں ناگوار کس لیے۔ کہتے ہیں کچھ خوشبوئیں شروع سے خوشگوار ہوتی ہیں اور کچھ ناگوار، اگر ایک دن دُودھ پیتے بچّے کی ماں کے پستان پر ہینگ لگا دی جائے، تو بچّہ دُودھ پینا چھوڑ دیتا ہے اور رونے لگتا ہے۔ لیکن اگر اسی پستان کو دُودھ سے لتھیڑ دیا جائے، تو وہی بچّہ ہمک کر اُس کی طرف لپکے گا اور اُس سے چمٹ جائے گا۔ میرا خیال ہے بعض خوشبوؤں کے ایٹم ہموار اور ملائم ہوتے ہیں اور وہ ہماری قوّتِ شامہ کو لطف عطا کرتے ہیں لیکن جن خوشبوؤں کے ایٹم نوکیلے ہوتے ہیں وہ ہمیں ناگوار گزرتی ہیں اور پریشان کرتی ہیں۔

ناران کی اس شام میں رات کے بہت سے ہموار اور ملائم ایٹم شامل تھے اور ہم سب

پر ایک خوشگوار کیفیت طاری تھی۔ مُفتی اپنی چارپائی پر نیم دراز پان لگا رہا تھا۔ مسعود اپنے ہاتھوں کی کنگھی بنا کر سرہانے کی جگہ رکھے سیدھا شہتیر لیٹا تھا اور اس کی دونوں کہنیاں چھت کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ مَیں نے ابھی اپنے بُوٹ اتارے تھے اور بستر میں اُلٹی پالتی مارے اپنے پاؤں دبا رہا تھا۔ ایسی ہی ایک شام کو میرے سب سے بڑے بھائی آفتاب فوت ہُوئے تھے۔ وہ فوت تو رات کے وقت ہوئے تھے، لیکن ہم سب کو پتہ چل گیا تھا کہ اب وہ زندہ نہیں رہیں گے۔ ان کا قد لمبا، بدن اکہرا، بال سیاہ اور آنکھیں چمک دار تھیں۔ وہ البرٹ وکٹر کے کوٹ نمبر ۲ میں لیٹے تھے اور ان کی سانس سے پھلوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ ایسی خوشبو جو نہایت ہی ہموار اور ملائم ایٹموں کا مجموعہ تھی جس کی خوشگواری میں موت کا پیغام تھا۔ آخری سلام تھا۔ ان کے کمرے کی بتی بھی مدھم تھی اور ان کی آنکھوں کا نُور بھی مدھم ہوتا جا رہا تھا۔ مَیں ان کے سامنے اپنی آستینیں چڑھائے کرسی پر بیٹھا تھا اور میرا آستین چڑھانے کا مقصد صرف اس قدر تھا کہ وہ میرے بازو پر بندھی ہُوئی چھوٹی سی پٹی دیکھ لیں جہاں سُوئی لگا کر آج صبح میرا ایک بوتل خون لیا گیا تھا۔ یہ خُون مَیں نے بھائی جان کے لیے دیا تھا اور بوتل ابھی ہسپتال کی فریج میں پڑی تھی۔ خون دینے کے بعد مَیں ریڈیو سٹیشن پر ہر ایک کو اور گھر پہنچنے پر قدسیہ اور نوکی کو بتا آیا تھا کہ مَیں نے بھائی جان کے لیے خُون دیا ہے اور اس سے مجھے بڑی رُوحانی خوشی حاصل ہُوئی ہے۔ میرے ماں باپ میرے شکر گزار تھے۔ لیکن میرے بہن بھائی کچھ لاتعلق سے تھے۔ اُنہوں نے ابھی قدسیہ کے ساتھ بولنا شروع نہیں کیا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس کا خاوند ان کے بھائی جان کے لیے خُون دے۔

بھائی جان تکیے سے سر لگائے کھڑکی کی طرف تکے جا رہے تھے اور اُن کی سانس سے پھلوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ مَیں نے پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ تو انہوں نے پُوچھا:

"وہاں کون ہے۔ کھڑکی میں؟"

مَیں نے کہا:

"کوئی نہیں بھائی جان! شام اُتر رہی ہے۔"

"شام!" انہوں نے مسکرا کر حیرت سے پُوچھا "اتنی جلدی؟"

"جی"

پھر اُنہوں نے آنکھیں بند کرلیں اور میں انہیں اندر کی شام کے حوالے کر کے باہر کی شام میں چلا آیا۔

شام رات میں تبدیل ہو رہی تھی اور ناران کے پہاڑ اندھیروں میں ڈوبتے جا رہے تھے۔ لیڈر اپنی کٹ تبدیل کر کے ہمارے دروازے پر آگیا اور سوئی بجا کر ہمیں جگانے لگا۔ وہ ہمیں کھانا کھلانے لے جا رہا تھا اور ہم تھکاوٹ کی وجہ سے ایک قدم چلنے کو تیار نہ تھے۔ اس نے چیخ کر کہا:

"اُدھر وہ دونوں مُردوں کی طرح لیٹے ہوئے ہیں۔ ادھر تم تینوں نہلائے دُھلائے کفنائے پڑے ہو۔ اگر اسی طرح پہاڑ پر آنا تھا، تو مجھے پہلے بتا دیا ہوتا۔"

"اس کو مارو" ادھر عماد نے نعرہ لگایا۔

"ناں ناں! لیڈر کو نہیں مارنا"... مسعود نے محبت کے ساتھ کہا... "عوام کو مارو"

"پھر اِدھر کی عوام تو مر چکی ہے، مشرقی پاکستان کی" اعظمی نے کہا۔ "اب تمہاری باری ہے"

"یار عمر" مُفتی نے کمبل کندھوں پر کھینچ کر کہا۔ "یہ کیسے بے حیا لوگ ہیں تمہارے پیرو۔ ایک تم ان کی خدمت کرتے ہو۔ انہیں ہر سال سیر پر لے نکلتے ہو۔ دُوسرے یہ تمہارا مذاق اُڑاتے ہیں۔ ایسی لیڈری سے تو ڈوب مرنا بہتر ہے"

"یہ ہمارا لیڈر نہیں مُفتی جی!"... عماد نے اپنی کوٹھڑی سے چلا کر کہا... "یہ ہیپیوں کا لیڈر ہے"

اس پر دونوں کوٹھڑیوں نے مل کر زور کا ایک نعرہ مارا اور مسعود اور اعظمی اپنی اپنی سوٹیاں لکڑی کی دیوار پر بجانے لگے۔ ہوٹل کا مالک خان بابا بھاگ کر آیا۔ اس کے ساتھ اس کا گونگا ملازم بھی تھا۔ دونوں کے ہاتھ میں چیڑھ کی جلتی ہوئی لکڑیاں تھیں جو وہ جلدی میں چولہے سے کھینچ لائے تھے۔

مُفتی نے تالی بجا کر کہا:

"لے یار عُمر! تیرا مشعل بردار جلوس نکلنے کا انتظام ہوگیا"

پھر ہم سب اتنے زور سے "ٹوڈی بچہ ہائے ہائے! ٹوڈی بچہ ہائے ہائے" کے نعرے لگانے لگے کہ ساری وادی میں ایک کُہرام سا مچ گیا اور خان بابا اور اس کا گونگا ملازم جلتی ہُوئی لکڑیاں بجھا کر واپس باورچی خانے میں چلے گئے — لیڈر دُنیا بھر کی خلیظ گالیاں دیتا ہُوا جائے واردات سے غائب ہوگیا اور ہم اپنی اپنی چارپائیوں پر پھر خاموشی سے لیٹ گئے۔

گوجروں کے قافلے اپنا اپنا مال لے کر ہماری کوٹھڑیوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ کچھ مویشیوں کے قدموں کی چاپ تھی۔ کچھ ان کے گلے میں بندھی ہُوئی گھنٹیوں کی آواز۔ کبھی کبھی اس قافلے میں ٹرانسسٹر کے بول سنائی دے جاتے یا پھر پس منظر میں دریائے گُنہار کی تیز موسیقی تھی۔

عماد نے اپنی کوٹھڑی سے آواز دے کر کہا:

"مسعُود!"

اور مسعُود نے اپنی چارپائی سے جواب دے کر کہا:

"ہاں!"

پھر خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر تک سب چُپ رہے، پھر مُفتی بولا:

"لکھ لعنت ہو تم دونوں پر۔ ایک نے کہا مسعُود۔ دُوسرے نے کہا ہاں اور بات کوئی ہُوئی نہیں"

عماد نے کہا:

"مُفتی جی میں نے اس کا جواب سُنا ہی نہیں، اس لیے خاموش ہوگیا"

مسعود نے کہا:

"اِس نے ہنگارے کا جواب نہیں دیا، اس لیے میں بولا نہیں"

اس پر ایک لمبی بحث چل نکلی۔ اعظمی کہہ رہا تھا میں نے مسعُود کا ہاں نہیں سُنا۔ میں اور مُفتی کہہ رہے تھے۔ مسعُود نے ہاں کہا ہے۔ دونوں طرف سے تاویلیں دی جانے لگیں، لیکن کسی بات

نے دوسری پارٹی کی بات نہ مانی اور جھگڑا طول کھینچ گیا، عین اسی طرح جیسے عید کے چاند پر جھگڑا ہوا کرتا ہے۔ پشاور میں ایک دن پہلے عید ہو جاتی ہے۔ لاہور میں ایک دن بعد۔ بحث مباحثے کے درمیان کافی بدمزگی ہوئی۔ میں نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی، تو برابر ایک نے میری نیت پر شبہ کیا اور میرے کمرشل بی ہیویئر کو دل کھول کر گالیاں دیں۔ پھر ہم سب کے دل میں ایک دوسرے کے بارے میں جو جو شکوک و شبہات تھے وہ آہستہ آہستہ باہر آنے لگے۔ ہم سب نے اپنے اپنے شکوک کا دل کھول کر اظہار نہیں کیا، بس اشارے سے کرتے رہے اور دوسرے ان اشاروں کو اچھی طرح سے سمجھتے رہے۔ صرف مفتی نے اعظمی کو کھری کھری سنائیں اور اس کا بولنا بند کر دیا۔ یہ کھری کھری باتیں پچھلے تین چار سال کی غلط فہمیوں پر محیط تھیں اور مفتی انہیں چوگا کھلا کر اندر ہی اندر پالتا رہا تھا۔ اس وقت اعظمی نہ بھاگ سکتا تھا نہ کان بند کر سکتا تھا نہ کوئی اس کی مدد کو پہنچ سکتا تھا۔

جب سب نے حسب توفیق اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکال لی تو دونوں کوٹھڑیوں میں خاموشی پھیل گئی۔ کوئی بیس منٹ تک سارے محبوسین اپنی اپنی چارپائیوں پر چپ چاپ لیٹے رہے۔ پھر اعظمی دھیمی آواز میں پکارا:

"مفتی جی!"

"جی چن جی" مفتی جی نے پان تھوک کر کہا۔

"آج کھانے کو کچھ ہے؟"

"آج غم کھاؤ!" مسعود نے ہولے سے کہا۔

"شاہ جی سے چیز مانگو سہیوال کا" عماد بولا۔

"چیز میرے پاس ہے" میں نے ایمانداری سے کہا۔ "لیکن اتنا نہیں کہ ہم سب کا پیٹ بھر سکے"

"خان سے دال دلوں لے لیتے ہیں" مسعود نے رائے دی۔

"اس کے پاس کیا ہوگا اس وقت" عماد بولا۔

"ضرور ہوگا" اعظمی نے کہا۔ "وہ جو جلتی لکڑیاں اٹھا کر لائے تھے، تو چولہے ہی سے

تو لائے تھے۔"

"چُولہے پر چائے ہوگی۔" مَیں نے دردناک آواز میں کہا۔

"اوئے بدذاتو! مَرے کیوں جاتے ہو۔" مُفتی نے نیا پان کلّے میں دباتے ہُوئے کہا۔ "ابھی لیڈر آجائے گا اور اس کی گود میں سامانِ خورونوش ہوگا۔"

"لعنت تیری سائیکالوجی پر۔" مسعود نے زور کا قہقہہ لگایا اور پھر ہم سب گیدڑوں کی طرح بولے:

"لعنت لعنت لعنت۔"

جب گیدڑ بولنے بند ہوئے اور کوٹھڑی کے سامنے چلتی ہُوئی کوہل کے پانی کی آواز سنائی دینے لگی، تو عمّاد نے کہا:

"یار مسعود عشا پڑھ لیں۔"

مسعود اس کی بات کا جواب دئیے بغیر ٹوپسی مار کر چارپائی سے اُٹھا اور آستین چڑھانے لگا۔

مُفتی نے کہا:

"یار کتنی رکعتیں ہوتی ہیں اس نماز میں؟"

"بس مُفتی جی! کیا نماز کیا رکعتیں۔" مسعود نے آہستہ سے کہا... "منّھا پھوڑی کرنا ہے۔"

پھر وہ کوٹھڑی سے باہر نکلا اور آسمان کی طرف دیکھ کر سنجاری کے انداز میں بولا: "ددی ددی ددی۔ باہر تو بڑی سردی ہے۔"

اس کی آواز سُن کر عمّاد بھی باہر نکل آیا اور دونوں کوہل کے کنارے بیٹھ کر برف کے پانی سے وضو کرنے لگے۔

مُفتی نے اپنا مخرج صحیح کر کے کہا:

"شاہ جی! سو گئے؟"

مَیں نے کہا:

"نہیں جی، جاگ رہا ہوں۔"

کہنے لگا:

"یہ نمازی لوگ بھی خوب ہوتے ہیں۔ میں ان کی دل سے عزت کرتا ہوں، لیکن ان کے ساتھ چل نہیں سکتا۔"

"وہ کیوں؟" میں نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"یہ نہ پوچھو شاہ جی!" اس نے باآوازِ بلند کہا۔ "میں نے زندگی میں جس آدمی کی بھی عزت کی ہے، اُس کے ساتھ کبھی نہیں چلا۔ میری عقیدت ضرور اس کے جلو میں رہی ہے لیکن میں کبھی اس کا ساتھ نہیں دے سکا۔"

میں نے کہا:

"مُفتی جی! یہ عزت بھی خوب چیز ہے۔"

کہنے لگا:

"اللہ اسے خوش رکھے، اس نے زندگی کے ہر مشکل مقام میں میرا بڑا ساتھ دیا ہے۔ میں نے جس سے بھی تعلقات منقطع کرنے چاہے، فوراً اُس کی عزت کرنا شروع کر دی۔ چند دنوں کے اندر، فریقین کی طبیعتوں پر بوجھ پڑے بغیر تعلق ٹوٹ گیا۔"

"اور وہ جو دھرمپورے کی اُستانی تھی... کیا نام تھا اُس کا؟"

"عالم بی بی۔" مُفتی جی نے ہولے سے کہا۔

"اس سے تعلقات منقطع کرنے کا بھی یہی طریقہ اختیار کیا تھا تم نے؟"

"ناں ناں ناں۔" مُفتی کہنی کے بَل ہو کر بیٹھ گیا۔ "اس میں میرا کوئی کمال نہیں تھا۔ اس میں اُس ہستی کا کمال تھا جس نے یہ تعلقات ختم کروا دیے۔ دُور بیٹھے بیٹھے۔ یہاں سے پانچ ہزار میل دُور۔"

میں نے کہا:

"تم قدرت اللہ شہاب کی بات کر رہے ہو؟"

"بالکل۔" مُفتی نے عقیدت سے کہا۔ "میں اس کی بات کرتا ہوں اور بج بجا کر کرتا ہوں۔"

"لیکن تم لوگوں کی نظروں میں اُسے کتنا ذلیل کرتے ہو" میں نے دُکھی ہو کر کہا۔

"ہُوا کرے۔ میں کوئی کم ہوتا ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے لوگ مجھے ایک چھوٹے درجے کا خوشامدی ٹٹ پُونجیا۔ مطلب پرست۔ افسر باز اور سائیکوفینسٹ نہیں سمجھتے؟"

میں نے کہا:

"سمجھتے ہیں"

"پھر شاہ جی!" مُفتی نے ران پر ہاتھ مار کر کہا۔ "لکڑی کے ساتھ جب لوہا لگتا ہے، تو ساری لکڑیوں کو تیرنے نہیں دیتا۔ میں تو اس کو ذلیل کر دُوں گا۔ اس نے میرے ساتھ کون سی بھلائی کی ہے؟"

میں نے کہا:

"بھائی یہ محبت اور محبوب کی باتیں ہیں اور میری سمجھ سے باہر ہیں"

"شاہ جی! وہ دوسری بات کرو!" اعظمی نے اپنی کوٹھڑی سے ہانک لگائی۔ "دھرمپورے کی عالم بی بی والی"

"ہت تیری سؤر زادے"۔۔ مُفتی نے ہنس کر کہا۔ "تو نے اِدھر کان لگا رکھے تھے"

"میرے کان تو ہر وقت آپ کی خدمت میں سوا دھان رہتے ہیں مُفتی جی!" اعظمی نے ہنس کر کہا۔ "لیکن یہ قصّہ کب کا ہے؟"

"بتا بھئی!" مُفتی نے مجھے اجازت دیتے ہُوئے کہا۔

"یہ پچھلے سال کا ہے اعظمی" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"یعنی جب مُفتی اُنہتر سال کا تھا؟" اعظمی نے حیرت سے پُوچھا۔

"بکواس کرتا ہے" مُفتی نے ہنس کر کہا۔ "اس وقت میری عمر پُورے اڑسٹھ کی نہیں ہُوئی تھی۔ تین مہینے باقی تھے ابھی"

"ارے شاہ" اعظمی نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ "ہمیں بتایا ہی نہیں"

میں نے کہا:

"میں نے کون سا سکھ پایا ہے اس قصے سے جو تمہیں بتاتا۔ عجب مصیبت کے دن تھے۔ مُفتی سنبھالے سے نہیں سنبھلتا تھا۔ ایک اکیلی میری جان، پھر اس بڈھے کے تقاضے۔ میرے تو بال سفید ہو گئے۔ خدا بھلا کرے احمد بشیر کا اور بانو قدسیہ کا جنہیں میں نے اپنے ساتھ شامل کر کے کچھ بوجھ ہلکا کیا، ورنہ یہ اب تک قتل کر چکا ہوتا۔"

"ہت تیرے کی شاہ!" اعظمی زور سے ہنسا اور اس کی ہنسی مُفتی کی ہنسی میں دب کر رہ گئی۔

عالم بی بی پچاس پچپن برس کی خاتون تھی۔ چمپئی رنگ۔ چمکدار آنکھیں۔ نوجوان چھب۔ کسی ہوئی جلد، محبت بھرا دل، خوش گفتار، نہایت سیانی، نہایت مکار، نہایت بھولی۔ میں نے آج تک کسی عورت کو اس کی طرح روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ دل چاہتا تھا وہ روتی رہے اور آدمی بیٹھا اُسے دیکھتا رہے۔ اس کے سینے میں محبت کرنے والا دل اور اس کے دماغ میں مرد کو قتل کرنے کے ڈیزائن بھرے تھے۔

"لو کتو! کھاؤ۔" عمر ایک آدمی کے سر پر روٹیاں اور شوربے کی دیگچی رکھوا کر لے آیا۔

"آگیا آگیا آگیا۔۔۔ لیڈر آگیا۔" مُفتی نے زور کا نعرہ لگایا اور عمر نے بچو کی طرح اُس کی نقل اُتاری۔ پھر عمر ہماری کوٹھڑی کے اندر پڑے ہوئے میز کو اپنے رومال سے صاف کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس نے کھانے کا سامان میز پر چُنا اور بڑبڑانے لگا۔ دراصل وہ ہمیں گندی گالیاں دے رہا تھا اور قسمیں کھا رہا تھا کہ اگلے سال وہ ہمارا لیڈر نہیں بنے گا اور مُفتی آہستہ آہستہ گنگنا کر کہہ رہا تھا:

"تو لیڈر بنے ہی بنے بلّیے تجھے اس سے اچھے عوام اور کہاں ملیں گے۔" مُفتی کی یہ بات سُن کر وہ اور چمکتا اور گالیوں کی بوچھاڑ تیز تر کر دیتا۔

اعظمی اپنی اُونی ٹوپی کانوں تک کھینچ کر ہماری کوٹھڑی میں آگیا۔ اس نے آتے ہی بتایا کہ نمازیوں کی نماز بھی ختم ہونے والی ہے اور اُنہوں نے کھانے کی خبر رکوع میں جاتے ہوئے سُن لی ہے۔

مُفتی نے کہا:

"وہ آجائیں، تو کھانا شروع کریں گے۔ جب تک ہم ہاتھ دھو لیں۔" پھر وہ ہاتھ دھونے

باہر کوہل پر چلا گیا، لیکن پانی میں ہاتھ ڈالے بغیر واپس آ گیا، کیونکہ باہر سردی کافی تھی اور برف کا پانی اس لائق نہیں تھا کہ اُس میں ہاتھ ڈالے جائیں۔

کھانا کھاتے ہُوئے ہم سب خاموش تھے اور کھا چکنے کے بعد ینیدرانے لگے تھے۔ کسی نے کسی سے بات نہ کی، جن کو ہاتھ دھونے تھے وہ صابن دانی لے کر کوہل پر چلے گئے جنہیں پونچھنے تھے وہ بستر کے ساتھ پونچھ کر لیٹ گئے۔ دونوں کوٹھڑیوں میں چار پائیوں پر سگریٹوں کے جگنو چمکنے لگے۔ مُفتی سو گیا۔ اُدھر سے بھی عماد کے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ مسعود نے سگریٹ کا آخری ٹوٹا کونے میں پھینکتے ہُوئے آہستہ سے پُوچھا:

"اشفاق اب تیری عُمر کتنی ہے؟"

مَیں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا، تو وہ کروٹ بدل کر سو گیا۔

جب مَیں روم میں تھا، تو میری عمر ستائیس برس کی تھی۔ اُس وقت بھی مَیں ایک ایسی ہی کوٹھڑی میں رہتا تھا، لیکن وہ کوٹھڑی زمین پر نہیں تھی، بلکہ ایک اُونچے مینشن کی چھٹی منزل پر تھی اور مجھے ایک سو سولہ سیڑھیاں طے کر کے اس میں پہنچنا پڑتا تھا۔ ایک کونے میں میرا بستر تھا۔ پائتی کی طرف چلمچی سٹینڈ تھا۔ کھڑکی کے پاس لکھنے کی میز تھی۔ اس کے ساتھ کپڑوں کی الماری اور الماری کے ساتھ ایک وارڈروب جس پر مَیں نے سٹوو لیمپ رکھا ہُوا تھا اور جہاں میں صبح سویرے اُٹھ کر کافی بنایا کرتا تھا۔ ہر روز رات کو سونے سے پہلے مجھے اپنے گھر کے سارے لوگ باری باری سے یاد آتے تھے۔ ہر چہرے کے داغ نمایاں ہو جاتے تھے۔ ہر آنکھ میں شفقت کی فراوانی ہو جاتی تھی۔ ہر آواز میں محبت کا لوچ بڑھ جاتا تھا۔ ہر لمس کا دباؤ گہرا ہو جاتا تھا اور ہر دباؤ کے ساتھ تنہائی کی شدت اور طویل ہو جاتی تھی۔ کچھ تنہائیاں اوائلِ عمر کی ہوتی ہیں۔ یہ انسانی زندگی کے لیے بھٹی کا کام دیتی ہیں۔ کچا کورا برتن تنہائی کی شیر گرم حدت سے پکنے لگتا ہے۔ ذرات گرم ہو کر ایک دُوسرے کو پکڑنے لگتے ہیں اور کورا برتن بجنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ نہ گلتا ہے نہ ڈوبتا ہے مسلسل ہچکولے کھانے کے لیے ایک وُجود بن جاتا ہے۔

مَیں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا اور ہمارے گاؤں میں میری بڑی آپا کی سہیلی باجی سلمٰے آئیں۔ یہ کسی کالج میں پڑھتی تھیں اور ریاضی کی طالبہ تھی۔ ان کے کانوں میں سونے کی نازک اور مرتعش

مثلیں آویزاں تھیں۔ وہ جب بات کرتی تھیں تو یُوں لگتا تھا جیسے ہنس رہی ہوں، جب مطالعہ کرتی تھیں تو ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے کسی کو یاد کر رہی ہوں۔ دونوں سہیلیاں شام کے وقت جب کھیتوں میں سیر کرنے جاتی تھیں، تو سارے راستے فضیلت کے باب بن جاتے تھے۔ مجھے سیدھے کھڑے ہونا، بالوں میں کنگھی کرنا، کہنیاں صاف کرنا اور ناک میں انگلی نہ ڈالنا باجی سلمیٰ نے سکھایا تھا۔ وہ جتنے دن ہمارے گھر میں رہیں میں اپنے دوستوں کے ساتھ کِبدو کھونڈی کھیلنے نہیں گیا۔ ماں کے ساتھ کبھی اُونچی آواز میں نہیں بولا۔ اباجی کے بوٹ اُتروانے اور اُن کے سلیپر لانا کبھی نہیں بھُولا۔ دراصل میں جو کام بھی کرتا تھا وہ باجی سلمیٰ کے نام معنون کر کے کرتا تھا۔ میری زندگی اور موت، رنج و غم، سود وزیاں، جو کچھ بھی تھا باجی سلمیٰ کے لیے تھا اور مجھے یقین تھا کہ ایک دن مجھے مرنا ہے اور لوٹ کر باجی کی خدمت میں پہنچنا ہے۔ گرمیوں کی جس صُبح اُنہیں ہمارے گاؤں سے چلنا تھا وہ صبح بڑی گرم اور جاں سوز تھی۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ ہَوا بند تھی۔ درخت خاموش تھے اور کھیت حبس کی وجہ سے ہانپ رہے تھے۔ گھر کے سب لوگ سلمیٰ باجی کو چھوڑنے سٹیشن پر گئے تھے اور گھر میں صرف میں اور اماں صُوباں رہ گئے۔ ہر ایک میری اس بیہودگی پر کہ میں باجی کو الوداع کہنے نہیں جا رہا، نالاں تھا۔ خاص طور پر میرے بڑے بھائی جو باجی کے ساتھ گھنٹوں علمی مسائل پر بحث کیا کرتے تھے۔

جب مجھے اپنے گھر کے اندر ریل کی سیٹی سُنائی دی تو میرا اندر بالکل خالی ہو گیا اور مجھے یُوں لگا جیسے میں اپنے وُجود کے آرپار دیکھ رہا ہوں۔ میں آہستہ آہستہ کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھا اور چھت پر آ گیا۔ کھجوروں کے جُھنڈ سے پرے پُرانی حویلیوں کے اُس پار ریلوے لائن تھی جو چھت سے صاف نظر آتی تھی، لیکن اس کا فاصلہ ابھی تک ناپا نہیں گیا تھا۔ میں اپنے کوٹھے کے موکھے دار پردے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اینٹوں سے گرد کی خوشبو آ رہی تھی اور موسم میں رات کی باسی گرمی کا خمیر تھا، پھر ایک اور سیٹی سنائی دی اور اس کے ساتھ انجن کی بھک بھک بھکا بھک کی آواز آنے لگی۔ حویلیوں کے کھنڈرات سے ذرا پہلے سیاہ دھوئیں کا بادل اُٹھا اور چاروں طرف پھیل گیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر انجن نے سیٹی بجائی اور سنپولیا سی گاڑی کھجوروں کے جُھنڈ سے باہر نکل آئی۔ جُھنڈ کے پیچھے آدھی گاڑی کو تو میں نے نکلتے دیکھا، لیکن اس کے بعد مجھ میں طاقت نہ رہی۔ میں

لمبی ہوئی کچی چھت پر لیٹ گیا اور میری ایڑیاں تیزی سے کہگل کی چھت پر چلنے لگیں، اگر میں بڑی عمر کا آدمی ہوتا اور میری شریانوں میں لچک نہ ہوتی۔ تو میں یقیناً مر جاتا۔ میرے دماغ کی کوئی رگ پھٹ جاتی اور میرے ناک منہ سے سیاہی مائل خون تیزی سے بہہ کر بائیں گال پر اترتا اور پھر زمین پر گر کر منجمد ہو جاتا۔ لیکن یہ کیفیت وقتی تھی۔ میں کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے تک اسی طرح چھت پر تڑپتا اور لوٹنیاں لگاتا رہا اور گاڑی اپنی منزل کی طرف چلتی رہی۔ یہ بے چینی یہ تڑپ یہ ذبح ہونے کی کیفیت بڑی تکلیف دہ تھی۔ لیکن اس تنہائی اور اداسی کے پاسنگ بھی نہ تھی جو سلمیٰ باجی کے چلے جانے کے بعد میرے وجود کے اندر آئی تھی۔ میری حالت اس اناڑی نے نواز کی تھی جو بانسری کے سوراخ میں پھونکیں مار مار کر اپنے آپ کو بانسری سے زیادہ خالی اور روزن دار کر چکا ہو۔ مجھے اپنے ارد گرد ہر شخص کی ذات ایک روح دکھائی دیتی تھی اور میں زندہ ہونے کے باوجود روحوں کے درمیان زندگی بسر کر رہا تھا۔ میں ایک جونک بن کر اپنے وجود کے ساتھ چمٹا ہوا تھا اور میرے وجود کا خون ختم نہیں ہوتا تھا۔

جوانی کا دور بڑا رنگین اور پُر فریب ہوتا ہے۔ اس میں ضروری نہیں کہ آدمی محبت کرے اور اس ثمر کی لذت سے آشنائی حاصل کرے۔ یہ وقت بجائے خود بڑا کیف پرور اور سرور انگیز ہوتا ہے، اس میں آدمی اور نہیں تو محبت کرنے والوں کے قریب ضرور رہتا ہے۔ مرتا نہیں تو کم از کم ان لوگوں کو ضرور دیکھتا رہتا ہے جن کے بدن موت کا فرشتہ اپنی نازک انگلی سے چھوتا اور انہیں اپنی طرف متوجہ کرتا رہتا ہے۔ اس دور کا خالی ہاتھ انسان، محبت کرنے والوں کی تنہائی اور اداسی کی ٹھنڈک سے اپنے وجود میں ایک مستقل کپکپی محسوس کیے جاتا ہے اور یہ کپکپی چپ چاپ اس لرزاہٹ کے ساتھ مل جاتی ہے جب وہ رحم مادر میں تھا اور اسے محفوظ و پرسکون ہونے کے باوجود تنہائی کا شعور تھا، لیکن یادداشت بہت کمزور تھی۔

قیامِ روما کے دوران میرے پاس ایک نوجوان آیا۔ یہ پاکستان کے کسی بڑے محکمے میں اچھا افسر تھا اور ٹریننگ کے لیے ہالینڈ بھیجا گیا تھا۔ ہالینڈ میں یو این او کے اس مخصوص کورس کے لیے دنیا کے اور ملکوں سے بھی سرکاری ملازم آئے ہوئے تھے۔ ان میں تمام ممالک کی ایک

لڑکی وکٹوریہ بھی تھی جو چینی نژاد کرسچین خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور انگریزی بڑی روانی کے ساتھ بولتی تھی۔ یہ پاکستانی نوجوان میرے پاس، میرے کمرے میں کوئی ہفتہ بھر رہا اور ہر وقت وکٹوریہ کی باتیں کرتا رہا۔ وہ اپنا کورس دو ہفتے پہلے ختم کر کے آگیا تھا اور وکٹوریہ کو ابھی ایک پندرھواڑہ اور وہاں صرف کرنا تھا۔ جب وہ وکٹوریہ کے حسن وجمال، اس کی مسکراہٹ، اس کے تبحّرِ علمی اور اس کی شفقت کا ذکر کرتا۔ تو اس کے چہرے پر ایک عجیب طرح کی اُداسی پھیل جاتی اور وہ روم میں ہوتے ہوئے ڈین ہاگ کی پُر پیچ گلیوں میں اُتر جاتا اور اس کا بایاں ہاتھ خود کلامی کرنے والے انسان کی طرح کھلنے اور بند ہونے لگتا —— ہم جب بھی باہر گھومنے کے لیے جاتے وہ کسی نہ کسی جگہ سے روم کا ایک ویو کارڈ ضرور خریدتا۔ مجھ سے الگ ہو کر اس پر پتہ لکھتا۔ پیغام والی جگہ پر ایک دو سطریں گھسیٹتا اور کسی قریبی ڈاکخانے میں وہ کارڈ پوسٹ کر کے مجھے اعتماد میں لینے کی غرض سے مسکراتا اور کہتا:

"وکٹوریہ کو لکھا ہے۔ تمہارا بھی سلام بھیجا ہے۔"

مَیں نے اتنے بڑے شہر، ایسے پُر رونق شہر، مجسّموں اور نوادروں کے معمورہ اور کیپٹل آف دا ورلڈ میں ایسا تنہا اور اُداس آدمی کوئی نہیں دیکھا۔ وہ ہر وقت میرے ساتھ باتیں کیا کرتا اور اندر سے غائب رہتا۔ وہ ہر وقت میرے ساتھ روم کے گلی کوچوں میں گھوما کرتا اور غیر حاضر رہتا۔ اس نے کبھی مجھ سے یہ نہ کہا:

"مَیں نے سُنا نہیں۔"

"مَیں نے دیکھا نہیں۔"

"مَیں نے خیال نہیں کیا۔"

"میری توجہ نہ تھی۔"

اس کے باوجود وہ میرے ساتھ نہیں تھا، میرے پاس نہیں تھا، میرے رُوم میں نہیں تھا، اپنے پاکستان میں نہیں تھا۔ وہ محبت کا مارا نہ تھا، محبت میں بھیگا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ہر وقت ایک مسکراہٹ رہتی اور اس کی آنکھیں شرارت سے ناچا کرتیں لیکن مَیں نے اپنی زندگی میں ایسا تنہا اور اُداس نوجوان اور کوئی نہ دیکھا تھا۔ مَیں جب بھی اس سے وکٹوریہ کے بارے میں پوچھتا وہ بغیر کسی تأمّل کے میرے ہر سوال

کا جواب دیتا۔ جب بھی از خود اس کا ذکر کرتا پُوری تفصیل اور ساری جُزئیات کے ساتھ کرتا۔ اس کے باوجود میرے اور اس کے درمیان تنہائی کا کوئی ہاتھ بھر کا فاصلہ رہتا اور میں اور سارا روم اور روم کے سارے مجسّمے اور سارے کلیسے اور اُس کے باغات اور اُس کے گورے بدنوں کی لڑکیاں، کوئی بھی اس کی تنہائی دُور نہ کرسکتیں۔ ایک ہفتہ میرے پاس قیام کرنے کے بعد وہ مجھ سے بغل گیر ہوکر نیپلز چلا گیا اور وہاں سے دخانی جہاز میں سوار ہوکر پاکستان روانہ ہوگیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد مجھ پر اُداسی کا ایسا دورہ پڑا کہ میں نے یونیورسٹی سے پانچ دن کی رخصت لی۔ اپنا اٹیچی کیس تیار کیا اور ہالینڈ روانہ ہوگیا۔ سہ پہر کے قریب میں ڈین ہاگ پہنچا۔ تھوڑی دیر ہوٹل میں سویا۔ پھر خاموشی کے ساتھ سگریٹ پیتا رہا۔ پانی پی کر ایک مرتبہ پھر سونے کی کوشش کی، لیکن نیند نہ آئی۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلا۔ تو معلوم ہُوا کہ ابھی ہیگ میں شام نہیں ہُوئی۔ ذرا ٹھہر کر ہوگی۔ مَیں بے مقصد بازاروں میں گھُومتا اور دُکانوں میں جھانکتا رہا۔ سائیکل چلاتی لڑکیوں کو دیکھتا رہا اور جب شام ہوئی تو مَیں وکٹوریہ کی انسٹی ٹیوٹ میں پہنچا۔ وکٹوریہ اپنے کمرے میں تھی، لیکن اس نے کہلا بھیجا کہ مہمان کو ملاقاتیوں کے کمرے میں بٹھائیے، مَیں ابھی آتی ہوں مَیں ملاقاتیوں کے کمرے میں بیٹھ کر رسالے دیکھتا رہا، پھر دیواروں پر لگی ہُوئی تصویروں کی تفصیلات کا جائزہ لیتا رہا، پھر اپنی کُرسی پر آبیٹھا اور دوبارہ رسالوں کی تصویریں دیکھنے لگا۔ سامنے کا دروازہ کھُلا اور سفید براق کپڑوں میں ملبوس وکٹوریہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی میرے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ اُس نے اپنا چھوٹا سا ہاتھ آگے بڑھا کر کہا:

"وکٹوریہ"

مَیں نے بڑی شائستگی کے ساتھ اُس کے ہاتھ کی اُنگلیاں آہستگی سے دبائیں اور سلیقے کے ساتھ کہا:

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہُوئی۔ میرا نام اشفاق احمد ہے اور میں راحت کا دوست ہُوں"

"راحت!" اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "کیسا ہے وہ؟ چلا گیا یا ابھی روم

میں ہی ہے؟"

"چلا گیا۔" مَیں نے کہا۔

"روم میں وہ تمہارے پاس ہی ٹھہرا تھا ناں؟" وکٹوریہ نے کرسی میرے قریب کھینچ لی اور ہم بڑی آہستگی سے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ پھر وہ کہنے لگی:

"اُداس تو نہیں تھا؟"

"تھا۔" مَیں نے مُرجھا کر کہا۔ "کچھ زیادہ ہی اُداس تھا۔ بہت ہی تنہا۔ ہر وقت تمہیں یاد کرتا تھا۔"

وکٹوریہ نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اپنی سفید کلائی پر ریسٹ واچ کی طلائی زنجیر ٹھیک کرنے لگی، پھر اُس نے سر اُٹھایا اور بولی:

"کب گیا؟"

مَیں نے کہا:

"روم سے تین دن ہُوئے روانہ ہو گیا تھا۔ اب معلوم نہیں "نیپلز" بھی کچھ دن ٹھہرا یا نہیں۔"

"نیپلز۔" اس نے چیخ کر کہا۔ "کیوں؟ کیا ہوائی جہاز سے نہیں گیا؟"

مَیں نے کہا:

"نہیں، وہ تو بحری جہاز سے گیا ہے۔"

"اوہ مو سیو اشفاق۔" اس نے دُکھی ہو کر کہا۔ "اسے بحری جہاز میں نہیں جانے دینا تھا۔ کتنے دن لگتے ہیں پاکستان پہنچنے کے لیے؟"

"نو دن۔" مَیں نے جواب دیا۔

"نو دن اور نو راتیں وہ اکیلا رہے گا، اکیلا سوچے گا۔ اکیلا بیٹھے گا۔ یہ اُس نے کیا کیا؟"

مجھے وکٹوریہ کی باتوں سے کچھ کمرشل قسم کی مجبوریہ ہونے کا شُبہہ ہُوا۔ وہ راحت کے بارے میں متفکر ضرور تھی۔ لیکن اس کی پریشانی ٹیکنیکل قسم کی تھی۔ اس میں رُوح کا فقدان تھا اور بار بار

سر ہلا ہلا کر چج چج کر رہی تھی۔ وہ کافی خوبصورت لڑکی تھی اور اُس کی گردن عام چینی عورتوں کے مقابلے میں لمبی تھی۔ اس کے بال بالکل سیاہ تھے اور اس کی ناک اس قدر چپٹی نہ تھی۔ اب اس کے سفید لباس میں مجھے لیموں کے رنگ کی لکیریں بھی نظر آنے لگیں۔ وہ مبتذل میں مبتلا ضرور دکھائی دیتی تھی، لیکن اس قدر بھیگی نہ تھی۔ اُسے دُکھ ضرور تھا، لیکن وہ تنہا نہ تھی۔ اُداس نہ تھی۔ ہم بڑی دیر تک اسی طرح چُپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر اُس نے آہستہ سے پُوچھا:

"خاور کے متعلق کیا کہتا تھا؟"

"خاور!" میں نے حیرانی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"خاور کے بارے میں اُس نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟" وکٹوریہ نے گلا صاف کر کے پُوچھا۔

"نہیں" میں نے اعتراف کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "وہ کچھ کہتا بھی تھا اور نہیں بھی کہتا تھا۔"

"وہ بیمار ہے اور خاموش ہے اور اس کو رونا نہیں آتا۔"

"وہی خاور ناں" میں نے دماغ پر جھوٹ موٹ زور دیتے ہوئے کہا۔ "جو اپنا .... کیا نام ... اُدھر..."

"کراچی سے آئی ہے" وکٹوریہ نے کہا۔ "تمہارے پاکستان سے۔"

"اُسے وہ روم سے ویزو کارڈ ضرور بھیجا کرتا تھا" میں نے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "اس سے زیادہ اُس نے کوئی خاص ذکر نہیں کیا۔"

"بڑا سنگ دل ہے تمہارا دوست!" یہ کہہ کر وکٹوریہ پھر خاموش ہو گئی۔

ایک مرتبہ سانتا ماریا ماجورے سے ٹرام میں سوار ہوتے وقت رش کی وجہ سے راحت کے کوٹ کا کالر اُلٹ گیا تھا اور اندر کی جیب میں احتیاط سے رکھا ہوا ویزو کارڈ نمایاں ہو گیا تھا۔ اس پر لکھا تھا ؎

تو می دانی کہ سوزِ قرأت تو
دگرگوں کرد تقدیرِ عمر را!

میں اس وقت اس شعر کا مکمل استعمال نہ سمجھا تھا، لیکن اب ہیگ میں آجانے کے بعد اور وکٹوریہ سے مختصر سی ملاقات کے بعد بہت سی ٹوٹی ہوئی کڑیاں آپس میں ملتی جا رہی تھی۔ وکٹوریہ رات کی محبوبہ نہ تھی بلکہ اس کی رازداں اور کونفی دانت تھی۔ اس نے ایک صبح ہوسٹل میں خاور کے کمرے سے گزرتے ہوئے اسے تلاوت کرتے سنا تھا اور اس کا کافر دل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مومن ہو گیا تھا۔ پھر وہ بھی اپنے کمرے میں اخبار بچھا کر فجر کی نماز پڑھنے لگا اور آہستہ آہستہ دونوں جانماز کو آڑے رُخ بچھا کر اکٹھے نماز پڑھنے لگے۔ جب انسانوں کے درمیان جسم کی محبت ہو، تو وہ ایک دُوسرے کی طرف مقناطیس کی طرح کھنچنے لگتے ہیں۔ جب ان میں آگہی اور دانش کی قدر مشترک ہو تو وہ لمبی سیروں، لمبے راستوں اور لمبے سفر کے ساتھی بن جاتے ہیں اور جب ان کی محبت پر رُوحانیت کا ابر اُتر آئے، تو وہ بستروں کے انبار میں دو معصوم بچوں کی طرح ٹانسے کی ایسی چادریں بن جاتے ہیں جس سے ان کی رہائی مشکل ہو جاتی ہے۔ یا تو چیخ چیخ کر مدد کرنے والوں کو بُلاتے ہیں یا دم گھُٹ کر مر جاتے ہیں۔ یہی کیفیت خاور کی تھی۔

جب میں اور وکٹوریہ اس کے کمرے میں پہنچے، تو وہ عشا کی نماز پڑھ رہی تھی۔ ہم ایک کونے میں کھڑے ہو گئے۔ اس نے سلام پھیر کر دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ دُعا مانگی اور اُٹھ کر چپلی پہننے لگی۔ پھر اس نے جانماز تہہ کیا اور اپنے سرہانے رکھ دیا۔ وکٹوریہ نے اس سے میرا تعارف کرایا، تو اس نے آہستگی سے "السلام علیکم" کہا اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔ ہم دونوں اس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے بات شروع کرنے کی کوشش کی، لیکن میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ میں نے ایسی تنہا، اس قدر اُداس، اتنی شانت اور ایسی دکھی لڑکی اپنی ساری عمر میں نہیں دیکھی۔ اس کا منگیتر پاکستان نیوی میں ملازم تھا اور اس نے کبھی کسی کا دل نہ دُکھایا تھا۔ خاور بھی اس کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھی۔

یہی تنہائی جب رینگتی رینگتی عمر کے آخری حصّے میں پہنچتی ہے تو آدمی انسانوں کی بولی سمجھنے سے قاصر ہونے لگتا ہے، پھر وہ پھولوں سے، جانوروں سے، دیواروں سے اور موسموں سے ڈائیلاگ شروع کر دیتا ہے۔ ایک بھرے ہوئے گھر میں جہاں اس کی بے پناہ عزت ہوتی ہے، جہاں اسے بے پناہ مان دیا جاتا ہے، وہ اپنے آپ کو ایک پُرانی کرسی، اُدھ کھلے دریچے اور بند

کتاب سے قریب تر پاتا ہے۔ ان کی اُداسی میں اس وقت اور اضافہ ہو جاتا ہے جب ان کے بچے ان کے لیے فادرز ڈے یا مدرز ڈے کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان کی تنہائی اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب گھر کے لوگ کسی اہم کام میں اُن سے مشورہ لیتے ہیں یا ان کے فیصلوں پر سر جھکانے کے لیے ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اس عمر میں کوئی طویل بیماری اُن کی تنہائی کم کرنے میں سب سے بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ کچھ بدنصیب ایسی بیماریوں سے صحت یاب ہو جاتے ہیں، تو ان کا آخری سہارا بھی ٹوٹ جاتا ہے اور وہ تنہائی کی ڈوری سے کھنچتے نہیں نفی کرتے نیستی کی آباد دُنیا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کی بات سمجھنے اور ان سے کلام کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اصل میں تکبر اور زعم کا ایک ہی علاج ہے اور وہ ہے تنہائی، مفارقت اور ایکانت۔ بڑے بڑے ولیوں، قطبوں اور غوثوں میں جب تکبر و زعم کا بیج پھوٹنے لگتا تھا، تو انہیں تنہائی اور مفارقت کا داغ دے کر سنسان وادیوں یا آباد شہروں میں چھوڑ دیا جاتا تھا، جہاں وہ کنجری بن کر ناچنے میں فخر محسوس کرتے تھے اور ناچ ناچ کر یار منانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ یہ تو دیوانے لوگ تھے، اگر کوئی معمولی آدمی بھی تخلیق کے کرشموں اور تخلیقی قوتوں سے آشنائی کا خواہشمند ہو تو اُسے ایک طویل عرصے کے لیے اپنے آپ کو تنہائی اور مفارقت کے حوالے کرنا پڑے گا۔ جب یہ تنہائی اس کا خون چوسے گی، اس کی صحت تباہ کرے گی، اس کے عزم و اعتماد کو دیمک کی طرح چاٹ جائے گی۔ اس کے ایمان اور اس کی خوشی کو گھن بن کر کھا جائے گی، تو پھر آہستہ آہستہ اُسے تخلیق کا عرفان ہونے لگے گا تخلیقی عمل کا شعور پیدا ہونے لگے گا۔

تنہائی، اُداسی، مفارقت اور ایکانت کے بارے میں سوچتا سوچتا میں بھی نیند کی وادی میں اُترنے لگا۔ خان بابا کی کوٹھڑی کے اندر میلے تکیے پر سر رکھے میرا باہر کی دُنیا سے جو تعلق تھا اُس کا آخری رشتہ ایک مہینے کی آواز تھا جو میری نیند کی پہلی جھوک میں جذب ہوتا جا رہا تھا۔

صبح سویرے چھ بجے سے ذرا پہلے لیڈر سوٹی لے کر ہماری کوٹھڑی میں آگیا اور ہمارے پیروں اور سروں پر ٹھولے مار کر ہمیں جگانے لگا۔ ہمارا لیڈر ایک روشن ضمیر، مستعد اور نیک نفس انسان ہے۔ اس کا دل جس قدر صاف ہے اسی قدر دماغ بھی صاف ہے۔ جب وہ